قسط ۳

لکھنؤ کی کربلائیں

عالیجناب شیخ تصدق حسین صاحب حنفی ایڈوکیٹ لکھنؤ

کربلائے نواب امین الدولہ امداد حسین خان

لکھنؤ میں حضرت عباس علیہ السلام کے پانچ روضے نامور ہستیوں نے تعمیر کرائے۔ سب سے پہلے مرزا فقیر بیگ نے بزمانہ حکومت نواب آصف الدولہ محلہ رستم نگر میں درگاہ حضرت عباسؑ کی بنا ڈالی جس کی پختہ عمارت اور سنہرا کمرخی گنبد بنوانے کی سعادت نواب سعادت علی خاں کو حاصل ہے۔ حکومت کی سرپرستی ہونے کے باعث یہ درگاہ سب روضوں سے زیادہ مقبول ہوئی۔ دوسرا روضہ عیش باغ میں بعہد دولت حضرت محمد علی شاہ داروغہ عاشق علی خاں نے بنوایا جس کو بعد تعمیر نواب ملکہ جہاں نے معاوضہ دے کر حاصل کر لیا۔ تیسرا روضہ اسی زمانہ میں میر امام علی رفیق الدولہ نے بمقام عباس باغ کاکوری کے راستہ میں تعمیر کرایا۔ چوتھا نواب امداد حسین خاں امین الدولہ نے دریا گنج میں اور پانچواں گھسیٹے خاں مصاحب الدولہ نے مصری کی بغیہ میں عباس باغ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر بزمانہ شہریاری جان عالم واجد علی شاہ نے بنوایا۔

کربلائے میر خدا بخش کو اگر براہ وکٹوریہ اسٹریٹ (وکٹوریہ گنج) جائیں تو کربلائے امین الدولہ شاہی اسپتال کے آگے داہنی جانب جا کر ملے گی۔ اس کربلا کو نواب امداد حسین خان امین الدولہ نے دریا گنج (سپّہ) میں تعمیر کرایا تھا جو حضرت امجد علی شاہ کے وزیر اعظم تھے۔ اس کو عوام الناس کربلائے امداد حسین خان بھی کہتے ہیں۔ اس میں حضرت عباسؑ کے روضہ کی نقل بنائی گئی ہے جس کی جھریوں میں آیات قرآنی نہایت نستعلیق خط میں مسالہ سے تحریر ہیں اور بنت اور رنگ آمیزی نہایت نفیس اور دلکش ہے۔ روضہ کے چاروں طرف صحنچیاں تعمیر ہیں جن میں قبریں بھی ہیں۔ صحنچیوں کے وسط میں چاروں طرف چار پھاٹک ہیں۔ میتوں کو غسل دینے کے لئے ایک غسل خانہ بھی ہے اور دو پتھر قدم رسول کے بھی برائے زیارت نصب ہیں۔

فرش میں رنگین چوکے بنائے گئے ہیں۔ یہ روضہ اب تک اچھی حالت میں ہے اور ۱۳۳۶ھ اور ۱۳۵۸ھ میں دوبار اس کی مرمت بھی ہو چکی ہے یہ کربلا ۱۲۶۴ھ میں شروع ہو کر عرصہ دو سال ۱۲۶۶ھ میں یعنی حضرت واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے تیسرے سال بن کر تیار ہوگئی۔ اس میں سو بیگہ آراضی پختہ قبرستان کے لئے وقف ہے جس میں تین بیگہ موجودہ متولی صاحب نے شامل کی ہے۔ روضہ کے صحن صحنچیوں اور باہر کی جانب اموات فرقہ امامیہ بلا معاوضہ دفن ہوتی ہیں۔ کربلا کے اخراجات کے لئے بانی مذکور نے بائیس ہزار روپیہ کے اور بروایتے دیگر پچھتر ہزار روپیہ کے پرامیسری نوٹ لکھنؤ کے ایک مشہور و معروف مجتہد صاحب کے پاس بطور امانت رکھ دیے تھے۔ مگر آخر الذکر کے انتقال پر ان کے ورثاء نے ان کو اپنے آبائی نوٹ ظاہر کر کے فروخت کر ڈالا اور کل رقم اپنے تصرف میں لائے جس کی وجہ سے کربلا کی مرمت شکست

وریجنٹ کے لئے مستقل سرمایہ باقی نہیں رہا اور ۱۹۱۹ء میں محکمہ تحفظ آثار قدیمہ کی نگرانی میں دے دی گئی۔ کہتے ہیں یہ روضہ اصل روضہ واقع کربلا سے بہت مشابہ ہے۔ روضہ کے اوپر ایک خشتی گنبد دو مینارے ہیں جو اصل روضہ کے قبہ اور میناروں سے بے حد مشابہت رکھتے ہیں روضہ کی تاریخ تعمیر حسب ذیل ہے جو اس کے برآمدہ میں لگی ہوئی ہے۔

کرد تعمیر چو نواب امین الدوله
مرقد پاک علمدارؑ شه عرش مقام
برق تاریخ رقم کرد بامداد حسین
شد بنا مشہد عباسؑ علمدار حسینؑ

۱۲۶۶ھ

دوسری تاریخ یہ ہے۔

ان ھٰذا مرقد العباسؑ ۱۲۶۶ھ

تیسری یہ ہے۔

امین[۱] الدوله نواب فلک جاه
که دارد الفت آل پیمبرؐ
بنا فرمود چوں درگاه عباس علیہ السلام
سلام حق برو تا روز محشر
چنیں تاریخ سالش گفت ہاتف
بنا شد خوابگاه ابن حیدر علیہ السلام

اس روضہ کے اول متولی نواب شرف الدولہ ضیغم الملک احمد حسین خاں صاحب عرف گونگے نواب مولوی امداد حسین خاں امین الدولہ کے بیٹے تھے جن کی تصویر روضہ کے برآمدہ میں آویزاں ہے۔ اس کے موجودہ سرگرم عمل متولی نواب سید محمد رضا خانصاحب عرف ننھے نواب ہیں۔

نواب امداد حسین خاں امین الدولہ قوم کے بنگش پٹھان تھے۔ ان کے والد کا نام خدا بخش خاں (یا امام بخش خاں) تھا اور والدہ کا عظمت النساء بیگم تھا۔ خدا بخش خاں کے والد شجاع دل خاں اور آخر الذکر کے حقیقی بھائی بایزید خاں سلطنت دہلی میں معزز عہدوں پر فائز تھے جب دہلی پر زوال آیا تو امداد حسین خاں کے والد عہد نواب آصف الدولہ میں لکھنؤ چلے آئے اور بتوسط رکن الدولہ میاں الماس علی خاں ناظم علاقہ جات رہے یہ کچھ دنوں نواب جلال الدولہ مہدی علی خاں کے یہاں تیراندازی سکھانے میں بھی ملازم رہے۔

امداد حسین خاں اولاً شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے یہاں بطور معلم ملازم ہوئے پھر سلطان عالم واجد علی شاہ اور ان کے چھوٹے بھائی سکندر حشمت مرزا جواد علی و دیگر شہزادگان کی تعلیم پر آغاز سلطنت حضرت محمد علی شاہ میں مامور ہوئے۔ بعد اس کے رفتہ رفتہ ولی عہد سلطنت ثریا جاہ مرزا امجد علی خاں کے دل میں جگہ کر کے ان کے رفیق خاص ہوگئے۔ مابعد محرم راز ہوکر داروغہ کاروبار ہوئے۔ تنخواہ میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ وقار بھی بڑھا صاحب سواری بھی ہوئے۔ (قیصر التواریخ)

بروز سیوم محمد علی شاہ ان کے فرزند و جانشین حضرت امجد علی شاہ نے ان کو امین الدولہ امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ خطاب دیکر سربلند کیا اور خلعت ہاتھی پالکی جھالردار، شمشیر ولایتی سے بھی سرفراز فرمایا اور بروقت چائے پانی کرسی نشینی کی اجازت ملی اور زمرۂ امراء میں شریک ہار و عطر رخصتی ہوئے۔ بتاریخ ۶ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ جب دومہینہ کئی دن گذر گئے تو شرف الدولہ محمد ابراہیم علی خاں کو جو محمد علی شاہ کے وقت سے وزیر چلے آتے تھے بوجوہات چند در چند برطرف کر کے ان کے بجائے نواب امین الدولہ کو خلعت وزارت بخشا جن کا خطاب کامل یہ ہوا۔ رکن رکین خلافت و جہانداری، اعتضاد سلطنت و شہریاری زبدۃ الامراء مدار المہام وزیر الممالک امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ، یار وفادار، فدوی خاص،

[۱]۔ افضل التواریخ مرتبہ منشی رام سہائے تمنا

جاں نثار محمد امجد علی شاہ بادشاہ خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ۔

امین الدولہ کے بڑے بھائی عطا حسین خاں کو بھی اعتبار الدولہ خطاب ملا اور دیوان عام کی داروغگی کا خلعت بھی عطا ہوا۔ ان کے پیش دست حیدر حسین خاں اہتمام الدولہ ہوئے جن کا پھاٹک چوک میں ان کے نام سے اب تک مشہور ہے۔

اودھ میں وزیر اعظم کی تنخواہ وائسرائے ہند کی تنخواہ کے برابر پچیس ہزار روپیہ ماہوار تھی اس کے علاوہ بھی جو روپیہ خزانہ شاہی میں بمد مالگذاری داخل ہوتا تھا اس میں پانچ فیصدی دستور معظم کا بھی حق ہوتا تھا۔ کرسی وزارت پر متمکن ہو کر نواب موصوف مہمات سلطنت کی گتھیوں کو اپنے ناخون تدبیر سے سلجھانے میں مصروف ہوگئے مگر مخالفتوں کی وجہ سے انتظام کی چول چوکس نہ بیٹھ سکی۔ اور سازشوں کا بھی زور وشور ہوا تو گھبرا کر معین الدولہ نواب عنایت علی خاں کی معرفت جو بادشاہ کے ماموں اور نواب کے ڈپٹی تھے استعفیٰ داخل کر دیا۔ انھوں نے استعفیٰ بادشاہ کی خدمت میں خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا بدیں وجہ بادشاہ نے منظور بھی کر لیا۔ ۱۱ ذیقعدہ ۱۲۵۹ھ کو بوقت صبح نواب نے لاعلمی سے پوشاک دربار طلب کی اتنے میں مرزا وصی علی خاں نے آکر عرض کیا کہ کل شب کو بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ امین الدولہ بغیر اجازت سوار نہ ہوں۔ نواب تحسین گنج سے دردولت تک پانچ روپیہ یومیہ فقرا و مساکین کو تقسیم کرتے تھے۔ اس روز وہ سب بیچارے مایوس ہو کر واپس چلے گئے اور شہر میں عام طور سے مشہور ہوگیا کہ نواب خانہ نشین ہوگئے۔ دوسرے دن چوبدار سلطانی نواب کی تنخواہ گھر پر پہونچا گیا۔ تیسرے دن بادشاہ کو پرچہ گذرا کہ نواب نے مفارقت قدم مبارک سے کھانا نہیں کھایا اس پر بادشاہ نے کھانوں کا ایک خوان اور ایک اچاری مربہ کی بھی عنایت فرمائی اور کہلا بھیجا کہ تقرری وموقوفی میری مرضی پر موقوف ہے تم دلجمعی سے اپنے مکان میں بیٹھے رہو۔ اس کے بعد نواب نے بادشاہ کی خدمت میں عرضداشت پیش کی کہ بعد خانہ نشینی دواب یعنی چوپایوں کے اخراجات مجھ پر بارگراں ہیں۔ امیدوار ہوں کہ یہ سب داخل دواب سرکار کئے جائیں۔ اس پر ارشاد کیا کہ کیا تم پھر سوار نہ ہوگے۔ اس کلام سے نواب کی طبیعت شگفتہ ہوگئی کہ انشاءاللہ میری طلبی پھر ہوگی مگر نہ مکان سے باہر جاتے تھے، نہ کسی سے ملاقات کرتے تھے۔ صرف ہر مہینہ تیرہویں تاریخ کو مجلس امام باڑہ راجہ جھاؤ لال واقع ٹھاکر گنج میں شب کو شرکت کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی بعد نماز صبح امین آباد کی عمارت دیکھنے چلے جاتے تھے۔

نواب کے ڈپٹی معین الدولہ صاحب لیاقت نہ تھے۔ اس لئے جب نواب منورالدولہ احمد علی خاں زیارت عتبات مقدسہ سے واپس آئے تو قلمدان وزارت ان کے سپرد کیا گیا معین الدولہ ان کے پیش دست ہوئے۔ مابعد بادشاہ نے معین الدولہ سے بدگمان ہو کر محاسبہ نظامت خیرآباد میں گرفتار کرا کے ان کے گھر پر پہرے بٹھادیئے۔ نواب منورالدولہ نے میدان خالی پا کر اپنے آوردی بھرتی کرنا شروع کر دیے۔ مقربان بارگاہ جن کے منہ کو لہو لگا ہوا تھا جب ان کے زمانہ میں کچھ فائدہ نہ حاصل کر سکے تو کہنے لگے کہ ان کے مقابلہ میں تو امین الدولہ ہی بہت غنیمت تھے۔

ادھر بادشاہ بغیر امین الدولہ کے مثل سیماب بیقرار تھے۔ کیونکہ بوجہ ملازم قدیم ہونے کے وہ ان سے بے حد مانوس تھے۔ آخر بروز جمعرات آخر جمادی الثانی بوقت سہ پہر امین الدولہ کو پھر یاد فرمایا اور اسی وقت قلمدان وزارت ان کے سپرد کیا۔ نواب منورالدولہ سبکدوش ہوگئے۔ اس کے بعد نواب امین الدولہ بادشاہ کے انتقال تک بلا خرخشہ فرائض وزارت انجام دیتے رہے ۱۸۴۷ء میں امجد علی شاہ کے انتقال پر ان کے فرزند واجد علی شاہ تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوئے۔ انھوں نے نواب کو منصب وزارت پر بدستور قائم رکھا اور خطاب میں

الفاظ، معتمد الخاقان استاد السلطان، بھی اضافہ فرمائے۔

جلوس واجد علی شاہ کو ابھی دو ماہ گذرے تھے کہ ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۶۳ھ کو نواب بقصد حاضری در دولت بگھی میں ملکہ زمانیہ کے امام باڑہ کے پاس والی سڑک پر براہ گولہ گنج تشریف لئے جاتے تھے کہ دفعتہً حیدر خاں، فضل علی، تفضّل حسین و علی محمد چار بدمعاشوں نے دادفریاد کا شور برپا کیا جب نواب نے گاڑی رکوائی تو ایک بے ادب نے بحیلۂ پابوسی نواب کی ٹانگ پکڑ کر بگھی کے نیچے گھسیٹ لیا اور شانہ وکلائی پر چرکے بھی لگائے پھر ملکہ زمانیہ کی مسجد کے نیچے ایک قصائی کی دوکان میں اٹھا کر لے گئے اور حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے ایک گرگے نے قرولی کی نوک نواب کے سینہ پر رکھ دی اور باقی تین بدمعاش ننگی تلواریں لیکر کھڑے ہو گئے۔

جب ریزیڈنٹ خبر پا کر موقع پر آئے تو حکمت عملی سے ان کو موذیوں کے نرغہ سے نکالا بعد چندے نواب نے ۲۳ جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ کو غسل صحت فرمایا۔

منشی رام سہائے تمنّا مصنف افضل التواریخ ناقل ہیں کہ اس سانحہ سے واجد علی شاہ کی طبیعت رنجیدہ ہو گئی اور ذہن اقدس میں یہ گذرا کہ نائب بے رعب قابل وزارت نہیں چنانچہ ۱۸ رجب ۱۲۶۳ھ کو بعد دو سال ۱۱ ماہ ۲۱ یوم منصب وزارت پر ممتاز رہ کر نواب خانہ نشین ہوئے۔ آراضی معافی و باغات عطیہ سلطان بدستور قبضہ میں رہے۔

مگر اصلیت یہ ہے کہ واجد علی شاہ (۱) نواب علی نقی خاں کو منصب وزارت عطا کرنے کے خود بیحد خواہشمند تھے کیونکہ بزمانہ ولی عہدی انھوں نے نواب کی معرفت حضور باغ تیار کرایا تھا جو ان کو بہت پسند آیا تھا۔ نواب علی نقی خاں کے سر پر بال بہت کم تھے۔ ایک روز واجد علی شاہ نے ان سے مذاقاً فرمایا کچھند یا پر بال کم ہونا وزارت کی علامت ہے انھوں نے برجستہ عرض کیا حضور کے تصدق میں یہ بھی ہوجائے گا۔ یہ بات واجد علی شاہ کے دل میں چبھ گئی اور وہ موقع و محل کے منتظر تھے چنانچہ انھوں نے اس واقعہ کا حیلہ پکڑ کے نواب کو علاحدہ کر دیا اور خلعت وزارت نواب علی نقی خاں کو مرحمت فرمایا۔

امین آباد کا بازار انہیں نواب امین الدولہ نے آباد کیا تھا زمانہ شاہی میں جو محلہ زیادہ آباد اور گلزار تھے وہ نیرنگی زمانہ سے اب ویران اور سنسان ہیں مثال کے لئے مفتی گنج دولت گنج، مصاحب گنج اور منصور نگر کو لے لیجئے۔ اور جو محلے غیر آباد تھے وہ اس وقت بہت پررونق ہیں حضرت گنج اور امین آباد کے بازاروں کا بھی یہی حال ہوا جو باوجود اپنے بانیوں کی سخت کوششوں کے زمانہ شاہی میں ان کے حسب منشاء آباد نہ ہوئے مگر اب ان میں ایسی بہار اور چہل پہل رہتی ہے کہ بمبئی اور کلکتہ کے چند بارونق محلوں سے ٹکر کھاتے ہیں۔

امین الدولہ پارک واقع امین آباد کی آراضی ابتداء میں خدیجہ خانم نواب شجاع الدولہ کی نانی کی تھی۔ انھوں نے اس میں ایک مسجد اور حمام وغیرہ معرفت مساۃ جے کنور بنوایا تھا جو ذات کی پرائن تھیں مگر آغوش اسلام میں آ گئی تھیں۔

جس سال مسجد وغیرہ بن کر تیار ہوئی اسی سال خدیجہ خانم کا انتقال ہو گیا اس طور پر یہ باغ اور مسجد پرائن کا باغ اور مسجد مشہور ہو گئی خدیجہ خانم کی قبر اسی باغ میں ہے جس پر ایک پختہ چبوترہ بنا ہوا ہے پہلے قبر پر ایک مقبرہ بھی بنا ہوا تھا جو تخمیناً ۱۹۱۶ء میں منہدم ہو گیا۔ امجد علی شاہ نے یہ کل املاک مع مسجد و دیگر عمارات متعلقہ باغ نواب امین الدولہ کو بزمانہ وزارت مرحمت کر دی تھی۔ انہوں نے باغ کا نام تبدیل کر کے اپنے نام پر اس کا نام امداد باغ رکھا اور اسی باغ میں ایک شاندار دو منزلی کوٹھی بنوائی جو کوٹھی کلاں کے نام سے مشہور ہوئی۔ جب امین الدولہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے تو ان کے اکلوتے بیٹے نواب اشرف الدولہ احمد حسین خاں عرف گونگے

(۱)۔ محل خانہ شاہی ترجمہ پری خانہ نوشتہ واجد علی شاہ

نواب کل متروکہ پر قابض ہوئے اور وہ کل آراضی جس پر امین الدولہ کی املاک تھی گونگے نواب کا احاطہ مشہور ہوگئی۔ بعد ہنگامۂ غدر یکم مئی ۱۸۶۴ء کو کیننگ کالج مع اسکول متعلقہ اسی کوٹھی میں قائم ہوا۔ اس کے بعد جب کیننگ کالج کی عمارت قیصر باغ میں بن کر تیار ہوگئی تو کالج اسی عمارت میں ۱۸۷۸ء میں منتقل ہوگیا اور اسکول ۱۸۹۰ء میں جوبلی ہائی اسکول میں شامل کر دیا گیا۔ تخمیناً ۱۹۱۴ء میں یہ کل املاک میونسپل بورڈ نے لے کر ایک پارک کی داغ بیل ڈالی جس کا نام نواب امین الدولہ کی یادگار میں امین الدولہ پارک رکھا گیا۔

پرانے زمانے میں چھتوں کو ہلکا اور ٹھنڈا رکھنے کی غرض سے ان میں مٹی کے گھڑوں اور کنڈوں کا بھراؤ دیا جاتا تھا چنانچہ جب گونگے نواب کی کوٹھی منہدم ہوگئی تو اس کی چھتوں سے سیکڑوں لمبوترے گھڑے برآمد ہوئے۔

ان جائدادوں کے علاوہ نواب امین الدولہ کی بہت سی املاک شہر لکھنؤ میں اور تھیں ایک سرائے سڑک کانپور پر واقع تھی۔ متعدد مکانات و محلسرائیں تھیں۔ فیل خانہ، شتر خانہ، کوٹھی وزیر منزل و حمام الماس باغ، احاطہ پختہ و خام فقیر محمد خاں، کئی مساجد اور گنج موسومہ پہوتھا نواب گنج واقع ضلع اناؤ یہ سب چیزیں ملکیت نواب تھیں۔ امین الدولہ پارک کے مقابل جانب جو امین الدولہ پارک ہے جس میں گھنٹہ گھر ہے یہ بھی نواب امین الدولہ کے باغ موسومہ گلاب باڑی میں بنا ہے۔ اس باغ میں داخلہ کے لئے نظیر آباد کے چوراہہ کے قریب ایک عالیشان پھاٹک تھا جس کو راقم الحروف نے بچشم خود دیکھا تھا۔ اس املاک کے علاوہ وہ کل جائداد جس پر ممتاز دارالیتامیٰ اور ورثاء جناب شیخ ممتاز حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا بذریعہ بیع قابض ہیں سب نواب امین الدولہ ہی کی تھی۔ آخر الذکر کل املاک ابتداء میں شہزادہ سلیمان شکوہ کی تھی ان کے بعد ان کے بیٹے مرزا عباس شکوہ قرض کے جنجال میں پھنس گئے اسی قرضہ میں کل جائداد نیلام ہوگئی اور امین الدولہ ان کے سمدھی نے اٹھائیس ہزار میں خرید لی فروری ۱۸۵۶ء میں سلطان عالم سلطنت و حکومت سے محروم ہو کر ماہ مارچ سنہ مذکور میں کلکتہ تشریف لے گئے۔ نواب منور الدولہ بطور مدار المہام شاہ معزول ان کے ہمراہ گئے۔ اسی سال نواب امین الدولہ نے فالج میں مبتلا ہو کر انتقال کیا اور اپنے ہی تعمیر کردہ روضہ میں مدفون ہوئے نواب موصوف کی علالت اور وفات پر سید کمال الدین حیدر مزید روشنی ڈالتے ہوئے قیصر التواریخ جلد دوم میں لکھتے ہیں۔

''اس عرصہ میں نواب امین الدولہ پر فالج گرا۔ یہی عذر آسمانی ان کی عافیت کا باعث ہوا۔ اپنے واسطے بہت متردد رہتے تھے کہ اگر اس وقت خاص میں بادشاہ کا شریک حال نہ ہوں گا تو موردِ طعن و تشنیع خاص و عام ہوں گا۔ چاہئے کہ میں نواب منور الدولہ سے بڑھ کر کچھ اپنے حق نمک و قدامت سے ادا ہوں تو موجب سرخروئی ہوگا۔ ادھر خوف جنرل (ریزیڈنٹ) کی ناراضی کا لاحق تھا۔ چنانچہ اپنی علالت میں اکثر شکر خدا کرتے تھے آخر انتقال کیا۔ اس لئے اجل نے ان کی عزت رکھ لی۔

۞ الواعظ

امین الدولہ کے آثار باقیہ میں اس وقت ایک کتاب اعمال الصالحین بھی موجود ہے جو اردو کا قدیم شاہکار ہے اس کتاب کو وزیر موصوف نے اپنے دربار کے فاضل اہل قلم مولوی سید مصطفیٰ بن مولوی سید علی اصغر صاحب سے فرمائش کر کے مرتب کرایا تھا۔ اس زمانہ میں اہل علم کے لئے اردو میں تالیف و تصنیف کا شغل نہ تھا جو قلم اٹھاتا تھا وہ فارسی یا عربی میں۔ نواب نے حکم دیا کہ ایک کتاب اعمال ماہ محرم و صفر اور نوافل پنجگانہ میں بزبان اردو ایسی تالیف کی جائے جس کو عوام اور عورتیں بھی سمجھیں اور بآسانی پڑھ لیں مؤلف نے افادیت کا

لحاظ کر کے تعمیل کی اور اردو میں کتاب لکھ کر حضرت سید العلماء علیین مکان طاب ثراہ مجتہد العصر کو سنا کر بتاریخ ۱۵ شعبان ۱۲۶۶ھ تقریظ حاصل کی وزیر موصوف کا پورا نام یہ ہے، نواب امین الدولہ عمدۃ الملک نواب امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ خطاب کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے۔

اے شان حیدری زجبین تو آشکار
نامِ تو در نبرد کند کار ذوالفقار

مولف نے دیباچہ کتاب میں امین الدولہ کو عابد شب زندہ دار بتایا ہے اس وقت اہل علم میں ان کا لقب ''امین الملۃ والدین'' تھا اس تالیف میں مولف نے اپنی عرق ریزی کا پورا اجر نواب موصوف کے لئے قرار دیا۔

اللّٰھم انفعنا بھا رسائل المومنین واجعل ثوا ب العمل مافی تلک الرسالۃ المختصرۃ لبافیھا وباعثھا مروّج الدین المبین الصارف عنان ھمته الیٰ اعلیٰ کلمة الحق علی الیقین امین الملة والدین المنوہ باسمه علی مرّالدھور وکرالسنین الیٰ یوم الدین۔

یہ کتاب حاجی ولی محمد کے مطبع سلطانی میں باہتمام داروغہ مدد علی سفید کاغذ پر چھپی پھر منشی نول کشور نے کچھ اضافات کے بعد اپنے پریس میں چھاپا اور غالباً کئی بار طبع ہوئی۔

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ شوال ۱۳۶۵ھ ستمبر ۱۹۴۶ء ص ر ۱۴ تا ۲۱ ر



کربلائے نواب سعید الدولہ لکھنؤ

یہ کربلا نصیر الدین حیدر بادشاہ کے شاہی اسپتال کے سامنے محلہ حیدر گنج قدیم میں لب سڑک واقع ہے اس میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا روضہ تعمیر ہے جس کے چاروں طرف غلام گردش ہے اور داخلہ کا شاندار پھاٹک شاہراہ عام کی طرف واقع ہے روضہ کے اندرونی جانب دلفریب رنگ آمیزی ہے اور آیات قرآنی نہایت خوش خط تحریر ہیں۔ بوجہ امتداد زمانہ غلام گردش کے کچھ حصہ منہدم ہو گئے ہیں اور کچھ باقی ہیں۔ کربلا کی بقاوداشت کے لئے کوئی جائداد موقوفہ نہیں ہے۔ روضہ کا پچھلا حصہ ناتمام ہے جس کے جانب جنوب چہار دیواری سے ملحقہ ایک تختہ آراضی میں تعزیہ دفن ہوتے ہیں نواب ذکی علی خاں عرف آغا صاحب مخاطب بہ خطاب سعید الدولہ، فریدوں مرتبت ممتاز الدولہ مدبر الملک مرزا حسین علی خاں بہادر تہور جنگ، کے فرزند اور نواب ناصر الدولہ اصغر علی خاں کے پوتے تھے۔ نواب ناصر الدولہ حضرت محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے پسر اکبر بادشاہ خانم کے بطن سے تھے۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد حکومت میں ان کی شادی اہتمام الدولہ مظفر علی خاں کی بڑی بیٹی سے بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی مگر محمد علی شاہ کے جلوس سلطنت سے کئی مہینہ پیشتر مرگ ناگہانی سے انتقال کر گئے اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو بجائے حضرت امجد علی شاہ کے موصوف ہی تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوتے۔

ناصر الدولہ (۱) کے فرزند دلبند ممتاز الدولہ تھے جن کی شادی نصیر الدین حیدر بادشاہ نے اپنی محبوب بیوی نواب ملکہ زمانیہ کی مادر جلو بیٹی نواب سلطان عالیہ بیگم سے کر دی تھی جن سے موصوف کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئی ہے۔ بیٹے کا نام ذکی علی خاں اور خطاب سعید الدولہ تھا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اور بیٹی کا نام عفت آرا بیگم عرف بگن صاحبہ تھا جو مرزا بہرام شکوہ محمد قمر الدین حیدر عرف چھوٹے صاحب عالم خلف نواب مصطفیٰ علی خاں برادر معظم حضرت واجد علی شاہ کو منسوب تھیں۔ مگر ۱۸۷۸ء میں عین زمانۂ شباب میں لاولد قضا کر گئیں۔

نواب سعید الدولہ کی شادی پرنس یحیٰی علی خاں مرزا اخرم بخت پسر حضرت محمد علی شاہ کی بیٹی سے ہوئی تھی جو شوہر کی حیات میں

(۱) قیصر التواریخ جلد اول

انتقال کر گئیں۔ ان کی رحلت کے بعد نواب سعید الدولہ نے اپنا دوسرا عقد اپنی پسند و مرضی سے بی عزیزن ساکن پاٹانالہ سے کر کے انھیں ممتاز محل کے خطاب سے ممتاز کیا، بعد میں دونوں میں جواہرات کی بابت کچھ جھگڑا بھی ہوا مگر موصوف نے خوبصورتی سے جواہرات واپس لیکر اپنے قبضہ میں کر لئے۔

بی عزیزن سے نواب سعید الدولہ کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام عصمت آرا بیگم عرف پٹن صاحبہ تھا۔ پٹن صاحبہ کی پہلی شادی خورشید مرزا کے ساتھ ہوئی جن کا سلسلہ نسب نواب دبیر الدولہ مرزا حیدر سے ملتا تھا۔ مرزا حیدر کے تین بیٹے نواب بہادر، مرزا والا جاہ اور نواب محمد تقی خاں عرف مرزا عالی جاہ تھے۔ نواب بہادر کی شادی نواب معتمد الدولہ آغا میر کی بیٹی سے ہوئی جو خورد محل بی جان کے بطن سے تھیں ان بیوی سے نواب بہادر کے ایک لڑکا خورشید مرزا اور ایک لڑکی ہوئی۔ خورشید مرزا (۱) نے ۱۹ جنوری ۱۸۷۵ء کو انتقال کیا وہ سو روپیہ ماہوار کے وثیقہ دار تھے ان کے انتقال کے وقت پٹن صاحبہ کی عمر صرف بیس سال کی تھی۔

نواب سعید الدولہ اور ان کے والد ممتاز الدولہ میں موافقت نہ تھی چنانچہ سعید الدولہ نے اپنی والدہ کے انتقال پر اپنے حق کے مہر کا دعویٰ اپنے والد کے خلاف دائر کیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں جب فوج باغی لکھنؤ میں آئی تو نواب ممتاز الدولہ مصلحت وقت سمجھ کر عنایت باغ سے جو بیلی گارد سے بہت قریب تھا اپنے قدیمی مکان گنگنی شوکل کے تالاب (۲) پر منتقل ہو گئے۔ چند روز وہاں قیام کر کے تلنگوں کے شر سے بچے رہے مگر تلنگے ایسا بھرا پرا گھر بھلا کب چھوڑ سکتے تھے۔ عنایت باغ سے کچھ اسباب لوٹ کر لے گئے۔ اس کے بعد نواب نے کچھ خرچ کر کے افسران فوج سے ایک دستہ سواروں کا اپنی حفاظت کے لئے متعین کرا لیا۔ خرچہ یومیہ انہیں ادا کرتے تھے۔ دروازہ پر شربت کی سبیل بھی رکھوادی تھی۔ مرزا قاسم بیگ داروغہ عنایت باغ صریح نقرہ لاکھ روپیہ کی توڑ کر لے آئے۔ آخر تلنگوں نے **ایک** جعلی خط پیش کیا جو تبے نواب (۱) نواب ساکن کانپور کی طرف سے آغا محمد حسین شیرازی کے نام بھیجا گیا تھا جو ممتاز الدولہ کے مکان میں رہتے تھے۔ اس خط کا مضمون یہ تھا کہ تم ممتاز الدولہ کا مفصل حال لکھو کہ کس حالت میں ہیں۔ اس جعلبندی سے نواب ممتاز الدولہ کو الزام دیکر گرفتار بلا کیا اور آغا محمد حسین کو لوٹ لیا۔ داروغہ میر واجد علی نواب کے بڑے ساعی ہوئے حضرت محل والدہ برجیس قدر نے کپتانوں سے سفارش کر کے بڑی جدو جہد سے انہیں چھڑوایا۔ جب نواب حاضر حضور جناب عالیہ (حضرت محل) و مرزا برجیس قدر ہوئے تو دو اشرفیاں بطور نذر پیش کیں۔ دوسرے دن نواب سعید الدولہ نے ایک چھوٹی سی ولائتی بندوق اور ایک تلوار مرزا برجیس قدر کو دی ایک دن کئی انگر کھے اور رومال بطور تحفہ لے گئے بلکہ ہر روز ایک نیا تحفہ لے جاتے تھے کبھی خالی ہاتھ نہ جاتے تھے۔ چند روز میں جناب عالیہ سے ایسی موافقت ہو گئی کہ دونوں ہم پیالہ و ہم نوالہ ہو گئے جناب عالیہ نے ان کی بیٹی سے مرزا برجیس قدر کی نسبت تجویز کی مگر کوئی رسم ادا نہ ہوئی صرف زبانی گفتگو رہی۔

Biographical Sketches by I.W Beali (۱)

(۲) قیصر التواریخ جلد دوم

---

(۱) تبے نواب معتمد الدولہ سید آغا میر کے بیٹے تھے۔ ان کا نام محمد علی خاں اور عرفیت ننھے نواب تھی، غدر کے زمانہ میں باغی سپاہ کی ایک مسلح جماعت نے موصوف کو بمقابلہ نانا صاحب بادشاہ قرار دینا چاہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ بہت رسوا ہو گئے تھے، ان کا مکان لوٹا گیا اور چند روز کے لئے نانا صاحب نے ان کو زیر حراست بھی کر دیا تھا ۱۸۶۱ء میں وہ مکہ معظّمہ چلے گئے اور وہیں جا کر ان کا انتقال ہو گیا۔

(Extract from Statistical Historical Account of NW Provinces of India Vol VI, 1881, pp 69-70)

سعید الدولہ عین عالم شباب میں شکار اجل ہو گئے ان کو سوزاک کی شکایت تھی ۔ سلائی دی گئی تھی اسی کی تکلیف سے جانبر نہ ہو سکے ۔ اپنی نانی ملکہ زمانیہ کے امام باڑہ واقع گولہ گنج میں مدفون ہوئے ۔

پتن صاحبہ کی کئی شادیاں ہوئیں ۔ آخری شادی نواب غلام حسین خاں کے ساتھ ہوئی ۔ موصوفہ گولہ گنج میں سکونت پذیر تھیں آخر میں زمینداری کے علاوہ ان کا وثیقہ قریباً پندرہ سو روپیہ ماہوار کا ہو گیا تھا ۔ بیسویں صفر کو وہ اپنا تعزیہ بہت دھوم سے اٹھاتی تھیں اس تعزیہ کی زیارت کو لوگ دور دور سے آتے تھے چہلم کی رونق بہت کچھ اسی تعزیہ پر موقوف تھی، تعزیہ کا جلوس بہت طویل اور پر شوکت ہوتا تھا گورکنوں، سبیل اور نقار خانہ کے بعد تقریباً پچیس تیس بلند قامت اور کوہ پیکر ہاتھی ہوتے جن کی مشکوں پر خوبصورت گل بوٹے بنائے جاتے تھے ۔ ہاتھیوں کی پشت پر نہایت خوشنما اور بیش قیمت کارچوبی جھولیں پڑی ہوتیں جن پر خوشنما وردی پہنے ہوئے علمبردار ماہی مراتب اور دیدہ زیب پٹکہ دار علم لئے ہوتے ان کے بعد ایک لمبی قطار پچاس ساٹھ اونٹوں کی ہوتی ان کی پشت پر بھی باناتی جھولیں ہوتیں اور بارہ دری علمبردار پٹکہ دار علم لئے ہوئے ہوتے پھر باد بہاری کے گھوڑے اور باجہ والوں کے بہت سے غول خوبصورت وردیاں پہنے ہوئے ہوتے ہر غول کیساتھ ایک دستہ جھنڈی برداروں کا بھی ہوتا تھا مگر ہر دستہ کی جھنڈیاں مختلف رنگ کی ہوتیں تھیں یہ منظر بہت ہی خوش آیند ہوتا تھا، آگے پیچھے مختلف رنگوں کی جھنڈیوں کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا موسم بہار میں مختلف رنگ کے پھول علٰحدہ علٰحدہ چمنوں میں کھلے ہوئے ہیں ۔ دو دستے تمامی کی جھلکتی ہوئی سنہری روپہلی بیرقوں کے بھی ہوتے تھے جو بہت ہی بہار دیتے تھے ۔

ان کے علاوہ اسپ سوار فوجی رسالہ، پولیس بینڈ باجہ، شہنائی نواز اور بین باجہ والے بھی ہوتے اور کبھی کبھی گوروں کا باجہ بھی ہوتا تھا ۔ نفاست اور ستھراپن اس جلوس کا طرۂ امتیاز تھا ۔

پتن صاحبہ نے ۱۲ مئی ۱۹۱۴ء کو یوم جمعہ تین بجے سہ پہر کو انتقال کیا اور نواب سعید الدولہ کی کربلا کے اندرونی درجہ میں دفن کی گئیں ۔ پتن صاحبہ کے بعد نواب غلام حسین خاں اس تعزیہ کو بڑی کوشش اور جانفشانی سے وضعداری کے طور پر اسی تزک واحتشام سے اٹھاتے رہے ۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے بھی انتقال کیا ۔ ان کی رحلت کے بعد سے تعزیہ اٹھنا موقوف ہو گیا اس کے ساتھ لکھنؤ کے چہلم کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا ۔

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ شوال ۱۳۶۵ھ ستمبر ۱۹۴۶ء ص ر ۲۵ تا ۲۷ ر



کربلائے نواب معتمد الدولہ

یہ کربلا شاہ زمن غازی الدین حیدر کے وزیر اعظم نواب معتمد الدولہ سید محمد خاں آغا میر نے حضرت گنج اور بنارسی باغ کے درمیان محلہ نرہی پر ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۵ء میں تعمیر کرائی تھی جس میں موصوف نے حضرت موسیٰ کاظمؑ کے روضہ واقع عراق کی شبیہ بنوائی تھی ۔ روضہ کے چاروں گوشوں میں چار گلدستہ ہیں جن میں چار چکردار زینے بنے ہوئے ہیں اور بالائی جانب تین گول قبے الٹی ناند کی وضع کے بنے ہیں دو آگے کی طرف اور ایک ان کی پشت پر ۔

روضہ کے اندرونی جانب صرف ایک درجہ تھا جو اب تک بدستور قائم ہے روکار اور پشت کی جانب چھ چھ کھڑکھڑیوں وار جوڑیاں ہیں اور تین تین ویسی ہی جوڑیاں بغلی دیواروں میں ہیں ۔ کربلا کا پھاٹک اور چہار دیواری معدوم ہو چکی ہے ۔ ایک مختصر سی مسجد بھی کربلا کے وسط میں تھی جو شکستہ حالت میں اب تک موجود ہے ۔ کربلا کے متعلق بارہ بیگہ دس بسوہ آراضی تھی جس میں تعزیے دفن ہوتے تھے ۔ گڈھوں کے اوپر سیٹھا اور پتا در پیدا ہوتی تھی جسکا ٹھیکا کبھی تین سو روپے کا اور کبھی چار سو روپے ہوتا تھا ۔ کربلا کے روضہ میں ایک اسکاٹس

میسن لاج ہے (Scottish Mason Lodge) جس کو عوام جادو گھر کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

غازی الدین حیدر اپنے پدر نامدار نواب سعادت علی خاں کی رحلت پر بتاریخ جولائی ۱۸۱۴ء مسند آرائے صوبۂ اودھ ہوئے۔ ان کے نائب ان کے منہ چڑھے دیرینہ خادم سید محمد خاں عرف آغا میر ہوئے۔ پھر آٹھ اکتوبر ۱۸۱۹ء مطابق ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۳۳ھ کو جب نواب غازی الدین حیدر خاں نے باشارہ گورنر جنرل اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے تخت سلطنت پر جلوس کیا اور تاج شاہی زیب سر کیا تو نائب کو وزیر اعظم مقرر کر کے ان کو معتمد الدولہ مختار الملک سید محمد خاں بہادر ضیغم جنگ خطاب عطا کیا اس وقت سے ۱۸/ اکتوبر ۱۸۲۷ء تک جبکہ بادشاہ نے اس دار فانی سے کوچ کیا موصوف ہی منصب وزارت پر فائز رہے۔

بتاریخ ۱۷/ اگست ۱۸۲۵ء[1] شاہ غازی الدین حیدر نے ایک کروڑ روپیہ معرفت ریزیڈنٹ اودھ مارڈنٹ رکٹس صاحب کمپنی کو بطور قرض ووام دیا۔ جس کا سود بحساب پانچ روپیہ فی صد سالانہ پانچ لاکھ روپیہ سالانہ اور مبلغ اکتالیس ہزار چھ سو چھیاسی روپیہ دس آنہ آٹھ پائی ماہوار ہوا اور طے پایا کہ یکم محرم الحرام ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۷/ اگست ۱۸۲۵ء سے منجملہ اور لوگوں کے پچیس ہزار روپیہ ماہوار بطور وثیقہ نواب معتمد الدولہ اور ان کے اہل خاندان کو حسب تفصیل ذیل ملا کریں گے۔

نواب معتمد الدولہ بیس ہزار روپیہ ماہوار، نواب بیگم اہل خانہ نواب معتمد الدولہ دو ہزار روپیہ ماہوار، عالیہ بیگم دختر نواب ایک ہزار روپیہ ماہوار، امین الدولہ آغا علی خاں پسر اکبر نواب دو ہزار روپیہ ماہوار جملہ پچیس ہزار روپیہ ماہوار۔

غازی الدین حیدر[2] نے اس گرانقدر وثیقہ ہی پر بس نہ کی بلکہ انتقال سے قبل ریزیڈنٹ و دیگر اعلیٰ حکام انگریزی کے بطور شاہد دستخط کرا کے ایک معافی نامہ بھی آغا میر کے حق میں اس مضمون کا تحریر کر دیا کہ سلطنت کا ایک حبہ بھی ان کے ذمہ واجب الادا نہیں ہے اور تحریر ہٰذا اس لئے دی جاتی ہے کہ میرے بعد میرا وارث وجانشین انھیں عاجز وپریشان نہ کر سکے۔

معتمد الدولہ نے (۳) اپنی ذاتی مصلحتوں کے پیش نظر غازی الدین حیدر اور ان کے پسر نصیر الدین حیدر کے درمیان بغض وعناد کی ایک فولادی دیوار حائل کر دی تھی، جس کی وجہ سے نصیر الدین حیدر کو سخت ایذائیں اٹھانا پڑیں حضوری شاہ سے محروم ہوگئے اور بادشاہ کے انتقال سے قبل تخمیناً تین برس تک قید وبند کی سختیاں بھی جھیلتے رہے۔ اسی سبب سے ان کو اپنی تخت نشینی کی بابت بالکل مایوسی اور ناامیدی ہوگئی تھی۔ مگر غازی الدین حیدر کی رحلت پر خداوندان ایسٹ انڈیا کمپنی نے موصوف ہی کا حق وراثت تسلیم کیا اور انھیں کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا اورنگ سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد دو ماہ تک موصوف خاموش بیٹھے رہے اور معتمد الدولہ سے عوض لینے کے منصوبوں پر غور کرتے رہے اس درمیان میں آغا میر ان کے ظاہری ونمائشی اخلاق ومراعات کے دام میں آکر بالکل غافل وبے خبر ہوگئے۔

غازی الدین حیدر کی رحلت تک تو معتمد الدولہ بموجب تحریر شاہ مرحوم مطالبۂ سرکاری سے بالکل بری الذمہ ہو چکے تھے مگر دو مہینہ دس دن گذرنے کے بعد بادشاہ نے انھیں یہ الزام لگا کر کہ انھوں نے اپنے منصب جلیلہ سے کثیر ناجائز فائدہ اٹھایا ہے لارڈ مائرا گورجنرل سے خفیہ گفت وشنید کر کے بتاریخ ۲۰/ دسمبر ۱۸۲۷ء بذریعہ ریزیڈنٹ انھیں گرفتار کرا دیا۔ صاحب رائے مورخ نے ان کی معزولی کی تاریخ کہی۔

آج اس گھر کا سنیچر اترا ۱۲۴۳ھ

---

[1] At KInson`s Treetise

(۲)۔ محتشم خانی

(۳)۔ قیصر التواریخ

تاریخ اسیری سے اکتوبر ۱۸۳۰ء تک معتمد الدولہ اپنی ہی حویلی واقع دولت پورہ متصل بازار راجہ میں زیر حراست رہے ان کے خارج البلد ہونے کا مسئلہ گورنمنٹ سے یوں طے ہوا کہ نواب مع اہل وعیال ومال واسباب بہ حفاظت ریزیڈنٹ شہر لکھنؤ سے باہر کسی مقام پر عملداری سرکار انگلشیہ میں جا کر رہیں۔ ان کے خلاف جو مطالبہ تھا اس کا بھی فیصلہ اس طرح ہوگیا کہ بائیس لاکھ روپیہ جو بابت ضمانت تنخواہ وغیرہ خزانہ ریزیڈنسی میں جمع تھے اور کل املاک واقع لکھنؤ مع کربلائے نرہی جس کی تعمیر میں نواب نے ایک کروڑ روپیہ سے زائد صرف کیا تھا دس لاکھ کی محسوب کر کے مجموعی بتیس لاکھ روپئے سرکار شاہی کو ادا کر دیئے اور اکتوبر ۱۸۳۰ء میں کانپور روانہ ہو گئے۔

قیصر التواریخ کے مصنف سید کمال الدین حیدر نے نواب کے نقد وجنس کا تخمینہ صرف دو کروڑ روپیہ کیا ہے مگر ہلٹن صاحب (**Hilton**) نے اپنی تصنیف لکھنؤ گائڈ (Lucknow guid) میں تحریر کیا ہے کہ نواب کا سامان آٹھ سو چھکڑوں اور بے شمار اونٹوں اور ہاتھیوں پر بار ہو کر کانپور گیا جس کی تخمینی قیمت پچیس کروڑ روپیہ تھی۔

کانپور میں موصوف نے آخر میں محلہ گوالٹولی میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں بقول ڈاکٹر اسپرائی (Dr. Spry) ۷رمئی ۱۸۳۲ء کو تپ صفراوی سے اور بقول منشی رام سہائے تمنا مصنف اشرف التواریخ درد گردہ سے انتقال کیا اور کانپور ہی میں بمحلہ مذکور دفن ہوئے۔

معتمد الدولہ کی سیرت ودیگر حالات کے بارے میں مصنف آفتاب اودھ حصہ اول میں تحریر کرتے ہیں:۔

معتمد الدولہ اگر چہ سید زادے تھے مگر ان کے بزرگان قریب میں کوئی شخص نام آور نہیں ہوا تھا اور یہ بذات خود اگر چہ صاحب علم نہ تھے مگر بڑے چالاک اور معاملہ فہم تھے، مزاج میں سخاوت بے انتہا تھی۔ ایک ایک رفیق ومصاحب کو ایک ایک وقت میں لاکھوں روپے دے ڈالنا ان کا ایک ادنیٰ کام تھا۔ یہ سخاوت حد اعتدال سے بہت بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے ہزاروں آدمیوں کے مکانات کھدوا کے اور اپنے مکانات و باغات وسیع تیار کر لئے۔

نصیر الدین حیدر کے بعد تاانتزاع سلطنت یعنی ۲۹ برس تک بعہد دولت حضرت محمد علی شاہ وامجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کربلائے نرہی میں مراسم عزا بدستور ہوتے رہے۔ فروری ۱۸۵٦ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے سلطان عالم کو سلطنت وحکومت سے معزول کر دیا۔ ان کی کل املاک واقع لکھنؤ بہ قبضۂ کمپنی چلی گئی اس کے ساتھ کربلائے نرہی پر بھی کمپنی کا قبضہ وتصرف ہوگیا۔ ۱۸۵۸ء میں جب غدر کے شعلے فرو ہو گئے اور ملکۂ وکٹوریہ شہنشاہ ہند قرار پائیں تو چند شاہی عمارتیں مثل امامباڑہ آصفی، کربلائے نصیر الدین حیدر جو نزول قرار دے دی گئی تھیں واگذار ہوگئیں۔ ۱۶راگست ۱۸۵۹ء کو بحکم ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کربلائے نرہی بھی واگذار ہوگئی اور صحت الدولہ حکیم مرزا مہدی استاد جنرل سکندر حشمت برادر خورد سلطان عالم کی سپردگی میں دے دی گئی بعدہ صحت الدولہ نے بحیثیت مختار وسفیر شاہ اودھ واگذار شدہ کے لئے شکریہ ادا کیا۔ اور یہ مزید استدعا کی کہ درگاہ حضرت عباسؑ ومقبرہ امجد علی شاہ کو بھی واگذار فرمایا جائے۔ ان کی درخواست بتاریخ ۱۹راکتوبر ۱۸۵۹ء ایبٹ صاحب (**Abbot**) اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ کو موصول ہوئی جس پر داروغہ نزول کو حکم ہوا کہ کربلائے نصیر الدین حیدر، مقبرۂ جناب عالیہ (مادر نواب سعادت علی خاں واقع گولہ گنج)، مقبرہ نواب سعادت علی وغیرہ نیز کربلائے نرہی واگذار شدہ کے متعلق رپورٹ داخل کریں کہ ان عمارات کے بانی کون کون بزرگ تھے نیز یہ کہ ہر ایک میں آراضی کتنی ہے اور آمدنی کتنی ہوتی ہے۔ چنانچہ ۲۹راکتوبر ۱۸۵۹ء کو

داروغہ نزول منشی کرامت حسین نے اپنی رپورٹ بایں مضمون پیش کی کہ کربلائے نرہی کو نواب معتمدالدولہ آغا میر نے ۱۲۳۳ھ میں یا اس کے ایک سال بعد بعہد دولت غازی الدین حیدر تعمیر کرایا تھا جس کو ۴۳ یا ۴۴ برس کا عرصہ گذرا اس میں آراضی تخمیناً ۱۲ بیگھہ دس بسوہ از قسم بھور ہے جس میں سیٹھا پتاور پیدا ہوتی ہے وسط میں ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے عشرہ محرم میں کل رقبہ میں تعزیے دفن ہوتے ہیں انھیں گڈھوں کے اوپر سیٹھا پتادر (پتاور) پیدا ہوتی ہے جس کا ٹھیکہ کسی سال چار سو روپیہ کا دیا جاتا ہے اور کسی سال تین سو روپیہ کا دیا جاتا ہے اس سال اس کا ٹھیکہ تین سو ستر روپیہ پر مکھن خاں کے نام ہوا ہے۔ عہد نصیرالدین حیدر میں ۱۲۴۴ھ یا ۱۲۴۵ھ میں معتمدالدولہ قید ہوئے اور ان کی جملہ املاک بہ علت باقی داری ضبط سرکار ہوگئی یہ کربلا بھی ملک شاہ اودھ ہوگئی اس وقت سے اس کی مرمت سرکار شاہی کی طرف سے ہوتی رہی اور آمدنی ملازمین وغیرہ پر صرف ہوتی تھی۔

رپورٹ مذکورۂ بالا پیش ہونے پر حسب الحکم حکام اعلیٰ کربلائے نرہی ۱۶/اپریل ۱۸۶۰ء کو پھر نزول سرکار ہوگئی ہمیں یہ تو نہ معلوم ہوسکا کہ اس میں فری مسن لاج کب اور کن شرائط کے ساتھ قائم ہوا مگر اس امر کا بخوبی علم ہے کہ لکھنؤ کے عزادار طبقہ کو اس روضہ کا جادو گھر کی شکل میں تبدیل ہوجانا بے حد شاق ہے اور اس کی واگذاری کا تہ دل سے متمنی ہے۔

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ ذی الحجہ و محرم ۱۳۶۶ھ/نومبر و دسمبر ۱۹۴۶ء ص/۵۹ تا ۶۲/



کربلائے بی مصری

یہ کربلا مصاحب گنج برف خانہ کے قریب واقع ہے۔ بی مصری نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں مشہور عورت تھیں، سفر و حضر میں حاضر باش رہتی تھیں۔ نواب موصوف نے تخمیناً بارہ بیگہ آراضی عطا کی تھی جس میں موصوف نے پیسہ لگا کر ایک مسجد اور سکونتی مکان بنوایا تھا۔ دونوں عمارتوں کے درمیان ایک معمولی سا امام باڑہ بھی تھا۔ مسجد نہایت خوبصورت بنی ہوئی ہے مگر استرکاری کے لباس سے آراستہ نہ ہوسکی تھی۔ امتداد زمانہ سے اس کے داخلہ کا پھاٹک اور بعض بیرونی درجے جو پھاٹک کی بغل میں بنے ہوئے تھے منہدم ہوچکے ہیں مگر صحن و دالان مسجد اچھی حالت میں ہے۔ امام باڑہ مختصر سا کمرہ کی وضع کا ہے جس میں ایک خوشنما مگر شکستہ چوبی ضریح رکھی ہوئی ہے۔ سکونتی مکان کے اب صرف کھنڈرات باقی ہیں امام باڑہ کے باہر ایک درخت کے نیچے گیارہ چھوٹی چھوٹی تربتیں بنی ہیں بقیہ میں تعزیے اور میتیں بھی دفن ہوتی ہیں۔

بی مصری پہلے کٹرہ ابوتراب خان میں رہتی تھیں مابعد اپنی بغیہ میں مکان تعمیر کرا کے وہیں منتقل ہوگئیں۔ اسی کی آراضی پر حضرت واجد علی شاہ کے زمانہ حکومت میں مصاحب الدولہ نے روضہ حضرت عباس علیہ السلام تعمیر کرایا۔ پہلے اس بغیہ میں کثرت سے تعزیے دفن ہوتے تھے، مخلوق کا بڑا ہجوم ہوتا تھا، عشرہ کے دن بازار لگتا تھا۔ اس کربلا کے جانب شمال ایک کربلا پوتی بیگم صاحبہ کی تھی مگر اب وہ قائم نہیں ہے۔ بی مصری کی دو لڑکیاں بی مریم اور بی مصاحبہ نامی تھیں۔ بی مریم میر عنایت علی کو اور بی مصاحب میر رجب علی کو منسوب ہوئیں۔ میر عنایت علی کے بیٹے میر امداد حسین تھے جن کے بیٹے میر محمد تقی بقید حیات ہیں۔ بغیہ کی آراضی پر ایک مہاجن کا کچھ بار ہوگیا تھا جس کی ادائی پہلے بحکم منصف صاحب جنوبی نیلام پر چڑھا دی گئی تھی اہل محلہ نے نواب باقر علی خاں صاحب رئیس شیش محل کو اس کے واگذار کرنے کے لئے توجہ دلائی۔ موصوف کے تعزیے اسی کربلا میں جاتے تھے۔ انہوں نے موقع ملاحظہ کیا اور زر مطالبہ جو تخمیناً ایک ہزار روپیہ یا کچھ زائد تھا اپنی جیب خاص سے ادا کر کے حسب قرارداد اس کا بیعنامہ میر محمد تقی سے

جناب مولوی آقا حسن صاحب مجتہد کے حق میں تحریر کرادیا جس کو تخمیناً چالیس سال کا عرصہ گذرا بعد تکمیل بیعنامہ نواب صاحب موصوف نے بغیہ میں ایک مجلس منعقد کی جس میں وہ خود اور مجتہد صاحب بھی شریک ہوئے۔ کربلا کے موجودہ متولی مجتہد صاحب مرحوم کے فرزند ہیں جن کی اجازت سے شیعہ حضرات کی اموات بھی بغیہ میں دفن ہوتی ہیں۔ شیش محل کے تعزیہ اسی کربلا میں جاتے ہیں۔

سید جالب مرحوم مدیر "ہمت" نے اخبار مذکورہ کی ۱۵ر مئی ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں بہت تجسس و تحقیق کے بعد لکھا تھا کہ مصری کی بغیہ جو نواب آصف الدولہ کی معشوقہ کے نام سے منسوب ہے لکھنؤ کا بہت پرانا قبرستان ہے۔ طبقہ امراء و شرفاء کے اکثر ارکان وہاں دائمی خواب راحت میں آسودہ ہیں۔ مثنوی سحرالبیان کے جادو نگار مصنف میر حسن مرحوم یعنی میر انیسؔ کے جد امجد اسی گورستان میں مدفون ہیں۔ بعض معمر بزرگوں کی زبانی جواب تہہ خاک موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں یہ بھی سننے میں آیا کہ تاج الشعراء میر تقی میرؔ کا مرقد بھی اسی بغیہ میں تھا مگر اب کوئی یہ بتانے والا بھی نہیں رہا کہ میر حسنؔ کی قبر کونسی ہے اور میر تقی میرؔ کا مزار کون سا ہے یا دونوں باکمالوں کے مرقد برقرار بھی ہیں یا دست برد زمانہ سے ناپید ہوگئے۔

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ ذی الحجہ و محرم ۱۳۶۶ھ/ نومبر و دسمبر ۱۹۴۷ء ص ۱۸ تا ۱۹/



کربلائے ملکہ جہاں

عیش باغ میں موتی جھیل کے کنارے کنارے جانب مشرق جائیں تو سامنے چند مینار و قبے نظر آئیں گے، یہی نواب ملکہ جہاں کی کربلا ہے۔ یہ کربلا ایک بہت بڑے پختہ احاطہ کے اندر واقع ہے جس کے چاروں طرف چار عظیم الشان داخلہ کے پھاٹک ہیں جن کی پیشانی کے گوشوں میں مسالہ کے پٹکہ دار علم اور جہری میں آیات لکھی ہوئی ہیں۔ بڑے احاطہ کے اندر ایک دوسرا چھوٹا احاطہ ہے جس میں دو روضہ واقع ہیں ایک تو حضرت امام حسین علیہ السلام کا جو بڑے حضرت کی کربلا کہلاتا ہے اور دوسرا حضرت عباس علیہ السلام کا جو چھوٹے حضرت کی کربلا کہلاتا ہے۔ دونوں روضوں کے درمیان ایک مسجد بھی تھی جواب خود سربسجدہ ہوگئی ہے۔

روضہ حضرت امام حسینؑ کی حالت نہایت ابتر ہے اندر اور باہر کا فرش کھدا پڑا ہے جس میں سپاہیوں نے اپنے مسکن بنائے ہیں۔ روضہ کے بیرونی جانب نہایت نفیس گلکاری تھی مگر اب قائم نہیں ہے۔ اندرونی حصہ بالکل سادہ ہے۔ روضہ کے اوپر آگے پیچھے دو گنبد ہیں جن کے آگے کی جانب دونوں بازوؤں میں دو گلدستے بنے ہیں اور ایک گلدستہ روضۂ کے بائیں جانب چند قدم ہٹ کر زمین پر بنا ہے۔ دوسرا حضرت عباسؑ کا روضہ بھی اندر سے بالکل سادہ ہے بیرونی جانب منبت و رنگ آمیزی نہایت دلکش ہے داخلہ کے دروازہ پر یہ مصرع تحریر ہے۔

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ ست

روضوں کے چاروں طرف رواق ہے اور بالائی حصہ میں ایک قبہ اور اسکے آگے گوشوں میں دو مینار ہیں۔ اس قبے میں خط ثلث کے کتبے بہترین قسم کے ہیں۔

کربلا کے احاطوں میں اموات بھی دفن ہوتی ہیں جن کے لئے حسب موقع معاوضہ دینا پڑتا ہے، اور میتوں کے غسل کے لئے ایک غسل خانہ بھی کربلا سے متصل واقع ہے۔ اس کربلا کو ابتداء حضرت محمد علی شاہ کے داروغہ عاشق علی خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ ان سے نواب ملکہ جہاں نے معاوضہ دیکر حاصل کرلی اس کے بعد روضۂ حضرت عباسؑ تعمیر کرایا۔

کربلا کی مرمت و شکست و ریخت کے لئے باہری جانب کچھ دوکانیں بھی تھیں، وہ قریب قریب کل منہدم ہوچکی

ہیں۔ اندرونی جانب ہر طرف شکستہ دیواریں، اینٹوں کے ڈھیر اور مٹی کے انبار نظر آتے ہیں جنہیں دیکھ کر وحشت ہوتی ہے، موصوفہ نے کربلا کی داشت کے لئے پورا انتظام کردیا تھا۔ علاوہ دوکانات مذکورہ کے چالیس یا پینتالیس بیگھہ کا ایک چک بھی موسومہ چک کربلائے حیدری قائم کیا تھا تاکہ کربلا کے کل اخراجات بآسانی چلتے رہیں، مگر ان کے پوتے نواب صاحب مرزا جون ۱۹۰۱ء میں ستر، اسی ہزار روپیہ کے قرضدار مرے۔ چنانچہ ان کے بیٹے نواب حیدر مرزا نے منجملہ اور جائدادوں کے کربلا کی آراضی کا جزو اعظم فروخت کرکے ان کا قرضہ بیباق کردیا جو کچھ آراضی قابل کاشت باقی رہ گئی تھی اس کو بھی جملہ حصہ دار ان نے تین سال قبل ایک مہاجن کے ہاتھ فروخت کردیا۔

۞ حالات داروغہ عاشق علی خاں

خواجہ محمد مقیم و خواجہ محمد سلیم پسران خوانہ محمد عظیم ابن خواجہ رحمت اللہ ساکن خطہ کشمیر جنت نظیر تھے، شاہ زماں نصیر الدین حیدر کے انتقال پر ۸/جولائی ۱۸۳۷ء کو محمد علی خاں نصیر الدولہ محمد علی شاہ کا لقب اختیار کرکے سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے اپنے دیرینہ رفیق عظیم اللہ خاں کو خطاب اعظم الدولہ اور اہتمام دیوان خانہ عام عطا فرمایا۔ ان کے پیش دست خواجہ محمد مقیم معروف بہ عاشق علی خاں ہوئے اور ان کے بھائی خواجہ محمد سلیم عرف علی جان کو مصاحبت شاہ کا افتخار حاصل ہوا۔ داروغہ صاحب کی تنخواہ ڈھائی سو روپیہ ماہوار سکہ سلطانی ہوئی۔ مگر بقول سید کمال الدین حیدر صاحب مصنف قیصر التواریخ انھوں نے پانچ برس کی ملازمت میں کئی لاکھ روپیہ پیدا کیا اور اپنی پوری زندگی چلن سے بسر کی۔

۱۶ مئی ۱۸۴۲ء کو محمد علی شاہ کے انتقال پر ان کے فرزند امجد علی شاہ نے تخت سلطنت پر جلوس کیا تو ایک مہینہ[1] کئی دن

(۱)۔ قیصر التواریخ

کے بعد اعظم الدولہ اور داروغہ عاشق علی خاں کو بہ سبب کدورت ہائے زمان ماضیہ اور شکوہ ہائے درونی، جو موقوف بروقت خاص رکھے تھے بتاریخ ۱۰ جمادی الثانی ۱۲۵۸ھ بروز پنجشنبہ[1] موقوف کردیا اور ان کے بجائے اعتبار الدولہ عطا حسین خاں برادر بزرگ امداد حسین خاں امین الدولہ کو مہتمم دیوان خانہ مقرر کرکے ان کا پیش دست حیدر حسین خاں اہتمام الدولہ کو کیا جو زمانہ ولی عہدی سے حاضر رہتے تھے۔ حیدر حسین خاں کا پھاٹک چوک بازار میں اب تک بنام پھاٹک حیدر خاں مشہور ہے گو عمارت فروخت ہو چکی ہے۔ خواجہ[2] محمد سلیم عرف علی جان مخاطب بہ فخر الدولہ برادر داروغہ عاشق علی خاں کو بھی اسی چاند میں جواب ہوا۔ داروغہ عاشق علی خاں نے بزمانہ ملازمت عیش باغ میں ایک عظیم الشان کربلا حضرت امام حسین علیہ السلام کی تعمیر کرائی خواجہ محمد وزیر متخلص بہ وزیرؔ نے قطعہ[3] تعمیر کربلا نظم کیا جو درج ذیل ہے۔

در عہد بادشاہ محمد علی نمود
عاشق علی زصدق بنا باغ کربلا
ہر صبح و شام از پئے شاہ زمن زشاخ
دارد بلند دست دعا باغ کربلا
پا از سر ادب نہد اینجا ملک کہ ہست
گلزار سید الشہداء باغ کربلا
چون گل شگفت غنچہ منقار عندلیب
مثل صبا ست عقدہ کشا باغ کربلا
نالد ہمیشہ او زصدائے شکست رنگ
دارد چہ عشق آل عبا باغ کربلا کردم
باوچو نسبت گلزار خلد گفت
اے وائے ماکجا و کجا باغ کربلا

(۱)۔ فسانہ عجائب (۲)۔ فسانہ عبرت
(۳)۔ دفتر فصاحت دیوان خواجہ میر وزیر

رویش بسوئے کعبہ و سویش رخ جہاں
ہم قبلہ ہست و قبلہ نما باغ کربلا
کردیم فکر سال بنائش چو اے وزیرؔ
بنو شت کلک فکرت ما باغ کربلا

جب کربلا بن کر تیار ہوگئی تو داروغہ صاحب نے نواب ملکہ جہاں سے زیارت کی درخواست کی انہوں نے منظور کر لی اور بروز مقررہ زیارت کرنے کے بعد عمارت کی بہت تعریف کی۔ داروغہ صاحب نے عرض کیا آپ کی نذر ہے۔ فرمایا مگر اس شرط سے کہ جو کچھ لاگت لگی ہو وہ لے لی جائے چنانچہ حساب کے کھاتے بھیج دیئے گئے ان کے بموجب تخمیناً پونے دو لاکھ روپے نکلے۔ روپیہ داروغہ صاحب کو دیدیا گیا۔ کربلا ملکہ جہاں کی ہوگئی۔

داروغہ عاشق علی سنی المذہب تھے ان کا مکان کٹرہ ابوتراب خاں میں تھا۔ محرم میں تعزیہ بھی رکھتے اور مجالس عزا بھی برپا کرتے تھے۔ ان کا امام باڑہ واقع کٹرہ مذکور ان کے پوتے نواب علی مرحوم کے فرزندوں کے قبضہ میں ہے۔ زمانہ غدر میں محمد خاں جرنیل مرزا برجیس قدر نے داروغہ صاحب کو انھیں کے مکان میں نظر بند کردیا تھا۔ دو لاکھ روپئے ان سے طلب کرتے تھے مگر انھوں نے برجیس قدر کی والدہ حضرت محل سے عرض معروض کر کے دس ہزار روپیہ پر معاملہ طے کرلیا۔ مابعد جب رعایائے شہر بخوف لوٹ مار اپنے اپنے مکان چھوڑ کر بھاگ گئی تو داروغہ صاحب بھی چلے گئے۔ ان کا مال واسباب خوب لٹا۔

۱۲ رجولائی ۱۸۶۳ء کو ایک وصیت نامہ تحریر کر کے انھوں نے ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا اور اپنی خاندانی ہڑواڑ واقع کٹرہ ابوتراب خاں میں مدفون ہوئے جہاں ان کی یادگار ایک عالی شان مسجد اچھی حالت میں اب تک موجود ہے، بعد وفات ان کا متروکہ مشتمل بر زمینداری و مکانات و باغات و زیورات وشیشہ آلات وغیرہ ان کے پانچوں بیٹے عاشق حسن، عاشق جعفر، عاشق عباس، عاشق سجاد اور عاشق عسکری اور سات بیٹیوں پر تقسیم ہوا۔ یہ کل اولادیں ان کی دو بیویوں سے تھیں فی بیٹا اٹھارہ ہزار روپیہ اور فی بیٹی نو ہزار نقد بھی تقسیم ہوا۔

یہ وہی روپیہ تھا جو کربلا کے معاوضہ میں وصول ہوا تھا۔ داروغہ صاحب کے انتقال پر برادری میں حصے بطریق توڑہ بندی اسم دار تقسیم ہوئے یعنی ہر خاندان کے کل چھوٹے بڑوں کو برابر کے حصے دیے گئے ایک مسلمہ شخص کھاتوں کے ساتھ روپیوں کی تھیلی لیکر ہمراہ جاتا تھا جس نے چاہا توڑہ لے لیا اور جس کے جی میں آیا اس نے حصہ کے عوض نقد روپئے لے لئے۔

داروغہ صاحب کے دوسرے بھائی قمر الدولہ خواجہ محمد سلیم عرف علی جان کو شیخ شہاب الدین عرف شیخ شبن کی بیٹی بوٹی خانم منسوب تھیں۔ قمر الدولہ بادشاہ کے مصاحب تھے اور بوجہ معتمد خاص ہونے کے بادشاہ کے کمرے کے پاس ہی شب کو آرام کرتے تھے ان کا سکونتی مکان خاص اس مقام پر تھا جہاں اب کوئین میری اسپتال (Queen Mary Hospital) تعمیر ہوا ہے۔

۱۸۵۷ء میں جب مچھی بھون بارود سے اڑایا گیا تو اردگرد کے تمام مکانات بھی گولوں سے ڈھا دیے گئے۔ اسی وقت ان کا مکان بھی منہدم ہوگیا۔

قمر الدولہ کی مخالف پارٹی کے لوگ ان سے بہت خار کھاتے تھے چنانچہ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ فسانۂ عبرت میں تحریر کرتے ہیں:-

''قمر الدولہ کے صفحۂ جبین پر نقش ارادت ماہ آسا نمایاں ہے مگر بندگان خاص میں ہلال عید کی صورت انگشت نمایہ متین کاروان ہے۔''

قمرالدولہ کے صرف ایک بیٹے داروغہ حسین جان[1] تھے جن کو بادشاہ نے داروغگی توپ خانہ پر مامور کیا تھا داروغہ حسین جان کی صرف ایک دختر بدرالنساء بیگم عرف وزیر بیگم تھیں جو داروغہ عاشق حسن خاں پسر اکبر داروغہ عاشق علی خاں کو منسوب تھیں۔ انہوں نے لاولد انتقال کیا۔ ان کا متروکہ مالیتی تخمیناً دولاکھ روپیہ اولاد داروغہ عاشق علی خاں کو ملا۔ قمرالدولہ اور ان کے پیرو مرشد حضرت حافظ شاہ سلیمان کی قبریں گئو گھاٹ میں پہلو بہ پہلو واقع ہیں۔ داروغہ عاشق علی خاں کے اکثر اہل خاندان کٹرہ ابوتراب خاں میں موجود ہیں اور فارغ البالی سے باعزت زندگی بسر کررہے ہیں۔

ان کے خاندان کے ان اراکین میں جو گلشن دہر کی سیر کرکے راہ عدم اختیار کرچکے ہیں دو ہستیاں بہت نامی اور فخر خاندان گذری ہیں ایک تو خواجہ عزیزالدین متخلص بہ عزیزؔ ان کے خویش بہ دوسرے ان کے نواسہ حکیم خواجہ کمال الدین مرحوم خلف خواجہ بہاءالدین جنہوں نے اپنے پیشہ طبابت میں بہت شہرت حاصل کی اور بڑی نیکنامی کے ساتھ زندگی بسر کرکے دنیا سے رخصت ہوئے، خواجہ عزیزالدین فارسی کے بڑے بلند پایہ شاعر اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ ان کے کلام نے اہل زبان تک سے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔ غزل، قصیدہ، تاریخ گوئی، ہرصنف سخن میں ان کا کلام موجود ہے۔ ان کا دیوان ان کے فرزند خان صاحب خواجہ وصی الدین صاحب نے زیور طباعت سے بھی آراستہ کردیا ہے۔

۱۹۱۳ء میں راقم سطور اپنے عزیز دوست خواجہ عاشق صادق صاحب نبیرہ داروغہ عاشق علی خاں کی شادی میں بارات کے ہمراہ کانپور گیا تھا جو نواب محمد ابراہیم خانصاحب کے دولت کدہ پر گئی تھی عزیزؔ مرحوم بھی دولہا کی طرف سے شادی میں شریک تھے انھوں نے کانپور میں بیٹھے بیٹھے انگلیوں پر کچھ شمار کرکے نوشاہ کے نام کی تکرار سے یعنی عاشق صادق، عاشق صادق کے اعداد سے سنہ شادی ۱۳۳۲ھ قائم کردیا۔ عزیزؔ صاحب کیننگ کالج میں پروفیسر بھی رہے تھے۔ اور ۱۹۱۵ء میں وفات پائی۔

خواجہ عزیزالدین مرحوم کی زندگی کا ایک نہایت مہتم بالشان لکھنؤ سے کشمیر جاتے وقت دہلی میں مرزا غالب کی ملاقات ہے، جس کا نقشہ خود خواجہ صاحب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

''مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا ایک بڑا پھاٹک تھا جس کی بغل میں ایک کمرہ اور کمرہ میں چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک نحیف الجثۃ آدمی گندمی رنگ اسی بیاسی سال کا ضعیف العمر لیٹا ہوا تھا۔ ایک مجلد کتاب سینہ پر رکھے آنکھیں بند گڑوے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ مرزا غالبؔ دہلوی ہیں جو بہ گمان غالب دیوان قاآنی ملاحظہ کررہے ہیں۔ ہم نے سلام کیا لیکن بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا کہ غالبؔ نے چارپائی کی پٹی کے سہارے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا ہم نے سلام کیا بمشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے ہم کو اپنے پاس بٹھایا قلمدان اور کاغذ سامنے رکھ دیا اور کہا آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا۔ جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ دو۔ نام ونشان پوچھا ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے ہر چند انھوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی مگر بے سود ہوئی جب ہم نے نام وپتہ لکھا تو کہا مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہوگے کچھ اپنا

---

(۱) مصنف قیصر التواریخ نے قمرالدولہ کے بیٹے کا نام حسن جان لکھا ہے مگر راقم الحروف کو ان کا وصیت نامہ مئورخہ ۱۰ مئی ۱۸۸۸ء مطابق ۲۷ شعبان ۱۳۰۵ھ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں انھوں نے اپنا نام حسین جان تحریر کیا ہے اب یا تو قیصر التواریخ میں کتابت کی غلطی ہے یا اس کے مصنف نے خود کسی غلط فہمی کی بنا پر بجائے حسین جان کے حسن جان لکھ دیا ہے۔

کلام بھی سناؤ۔ ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبان مبارک سے سننے کی غرض سے آتے تھے بہت دیر تک اپنا کلام سنایا کئے۔ پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سناؤ ہم نے یہ مطلع سنایا۔

مہ مصر است داغ از رشک مہتابے کہ من دارم
زلیخا کو رشداز حسرتِ خوابے کہ من دارم

عجیب لطف اور مزے سے سنا اور حد سے زیادہ تعریف کی پھر آدمی سے کہا کھانا لاؤ ہم سمجھے بخیال مہمان نوازی تکلیف کر رہے ہیں لکھ دیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لئے دہلی اتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے۔ اسباب بندھا ہوا رکھا ہے پا بہ رکاب آپ سے ملنے آئے تھے اب اجازت چاہتے ہیں کہنے لگے آپ کی غایت اس تکلیف سے یہ تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھے خبر نہیں ہوتی۔ غزل کے پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا کہ کلام سنا اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں اس کو بھی ملاحظہ کرتے جایئے اتنے میں کھانا آیا دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پھلکے کی باریک پرت لیکر دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا بڑھا دیا تعجب ہوا کہ اس مقدار خوراک پر کیونکر بسر کرتے ہیں۔

ملکہ جہاں محمد علی شاہ بادشاہ کی بہت چہیتی بیوی تھیں چنانچہ خان بہادر مولوی مسیح الدین کاکوروی سفیر آخری شاہ اودھ اپنی تصنیف ''سفیر اودھ'' میں تحریر کرتے ہیں۔

''ایک بار ایک خط رسمی طور پر بادشاہ کے نام پر ظاہراً کچھ تنخواہ وثیقہ مقرر کرنے کے واسطے ملکہ جہاں کے لئے جو محمد علی شاہ کا ایک محل ہے لکھا گیا اس میں میرے نائب کے سہو سے خطاب ملکہ جہاں کا نہ لکھا گیا صرف ان کا نام یا شائد حرم محترم کی لفظ ان کے نام کے بعد لکھی گئی اس خط کو بادشاہ نے پھیر دیا اور کچھ شکایت بھی لکھ بھیجی۔

ملکہ جہاں کی شادی بادشاہ کے ساتھ بزمانہ نوابی ہوئی تھی جبکہ موصوف دولتخانہ آصفی میں سکونت پذیر تھے سلطنت اور حکومت ہاتھ آنے پر بادشاہ نے بمقابلہ خاص محل نواب ملکہ آفاق ان کو نواب ملکہ جہاں کا خطاب دیا۔

ملکہ کا نام حسینی خانم اور ان کے باپ کا نام حسین علی تھا۔ موصوفہ بہت قبول صورت اور سلیقہ مند تھیں خط نسخ خوب تحریر کرتی تھیں۔ بادشاہ نے نواب معتمد الدولہ آغا میر کی کل ضبط شدہ املاک واقع دولت پورہ مع وزیر باغ و بلند باغ بذریعہ فرمان شاہی ان کو عطا کردی تھی۔ انھوں نے مجالس عزا بھی بہت حوصلہ مندی سے کیں۔ نوابی [1] کے زمانہ میں ان سے ایک لڑکی مجلسی بیگم محمد علی شاہ کے پیدا ہوئی تھی جو ۱۲۵۲ء میں کمسنی میں انتقال کر گئی۔ جمنیا باغ اس کا مدفن قرار پایا، عنان حکومت ہاتھ آنے پر ۱۲۵۳ھ میں محمد علی شاہ نے اپنے امام باڑے حسین آباد کا نقشہ اس طرح تیار کرایا کہ مرحومہ لڑکی کی قبر اس کے چمن میں آگئی جس کے اوپر خشت اور مسالہ سے تاج محل کے روضہ کی نقل تعمیر کردی گئی۔ انھیں بیگم سے بادشاہ کے ایک بیٹے بھی تھے جن کا نام ہمایوں بخت مرزا احمد علی خاں تھا۔ ان کی شادی نواب نور بیگ خاں رئیس مدراس کی بیٹی سے ہوئی تھی جن کو سسرال سے خاقان بہو کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ان کی محل سرا موسومہ خاقان منزل محلہ وزیر گنج میں اب تک موجود ہے۔ ملکہ جہاں [2] نے ۹ جولائی ۱۸۸۱ء کو انتقال کیا۔ لاش کربلائے معلی بھیجی گئی۔

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ شعبان ۱۳۶۵ھ/ جولائی ۱۹۴۶ء ص/ ۱۲ تا ۱۸/



---

[1] تاریخ اودھ مولانا نجم الغنی حصہ چہارم

[2] ملکہ جہاں کی مفصل سوانح حیات کے لئے دیکھئے راقم الحروف کا مضمون بعنوان ''نواب ملکہ جہاں'' (بہ سلسلہ شاہی بیگمات اودھ)

کربلائے ملکہ آفاق

شاہ نصیر الدین حیدر کی کربلا کے جانب غرب تھوڑی ہی دور پر محلہ مکا گنج میں ملکۂ آفاق کی شہرۂ آفاق کربلا واقع ہے جس کے گنبدوں اور میناروں کی سنہری کلسیاں دور ہی سے جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کربلا کا دوسرا نام عسکرین بھی ہے۔ کربلا میں داخلہ ایک بلند اور عظیم الشان پھاٹک کے ذریعہ ہوتا ہے جس کے اندر چند قدم جا کر داہنی جانب ایک دوسرا خوشنما شاندار پھاٹک ملتا ہے جس پر دھات کی ٹھپہ کی ہوئی تختیاں جڑی ہیں اور بالائی حصہ کے گوشوں میں پٹکہ دار علم ہیں۔ اس پھاٹک کے اندر جا کر ایک لمبا مستطیل حوض ملتا ہے جس کے سامنے ہی امام باڑہ کی عمارت ہے جس کے آگے چبوترہ پر پرنالی دار جستہ کی چادروں کا ایک وسیع سائبان پڑا ہے اور دونوں جانب غلام گردش کی صحنچیاں ہیں اور چھت پر دو بڑے گنبد بنے ہیں جن پر مختلف رنگ کے دیسی چوکے لگے ہوئے ہیں۔

امام باڑہ کے اندر شہ نشین پر ایک تعزیہ رکھا ہے جس کی پشت پر کچھ پٹکہ دار علم استادہ ہیں اور دیواروں کو چند قطعوں اور مرقعوں سے مزین کیا گیا ہے۔

سب سے زیادہ قابل تذکرہ اس امام باڑہ کا فرش ہے جس پر دیسی ساخت کے زرد، سرخ اور سبز مختلف وضع قطع کے روغنی چمکدار چوکوں کی ساز سے شطرنجی فرش تیار کیا گیا ہے جو چمک دمک اور خوشنمائی میں جاپانی چینی چوکوں سے ٹکر کھاتے ہیں۔ زمانہ شاہی میں یہ چوکے لکھنؤ میں بہت بنتے تھے۔ ان کے علاوہ مٹی کی سرخ و سبز رنگ کی چمکدار روغنی جالیاں اور کلسیاں وغیرہ بھی تیار ہوتی تھیں مگر عدم سرپرستی کے باعث یہ صنعت معدوم ہو کر رہ گئی۔ یہ اشیاء ۱۸۸۵ء تک لکھنؤ میں دستیاب ہوتی تھیں جبکہ ان کا آخری کاریگر گلاب کمہار دنیا سے رخصت ہو گیا اور اس صنعت کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔

امام باڑہ کے بائیں جانب دوسرے ملحقہ احاطہ میں ایک دوسری عمارت ہے جس میں حضرت امام حسن عسکری و حضرت امام علی نقی علیہم السلام کے مزارات واقع سامرہ کی نقل بنائی گئی ہے۔ اس روضہ کی گلکاری و رنگ آمیزی قابل دید ہے۔ اس کے بالائی حصہ میں ایک قبہ اور دو گلدستے بنے ہیں جن کی سنہری کلسیاں نہایت ہی جاذب نظر ہیں۔ ایک مسجد بھی ہے جس کے نیچے بہت دور تک تاریکی میں پیچدار زینے چلے گئے ہیں جو ایک کنویں پر جا کر ختم ہوئے ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت مہدی آخرالزماں اسی مقام سے اہل دنیا کی نظروں سے غائب ہوئے تھے۔ آخرالذکر دونوں عمارتوں کے فرش بھی دیسی رنگین چوکوں سے بنے ہوئے ہیں۔ پندرہویں شعبان یوم ولادت حضرت صاحب الزماں حضراتِ مومنین اس سرداب میں جمع ہو کر نذر و نیاز و روشنی کرتے ہیں اور دس بجے دن کو امام باڑہ میں صحبت فضائل بھی ہوتی ہے۔

ملکۂ آفاق کا سلسلۂ خاندان وزیر اعظم دہلی سے ملتا ہے۔ یہ نواب امام الدین خاں کی بیٹی تھیں جن کی بہن شمس النساء بیگم متخلص بہ شرمؔ نواب آصف الدولہ کو منسوب تھیں۔ نواب امام الدین خاں وزیر اعظم دہلی کے پوتے تھے۔ ملکۂ آفاق کے بھائی حسین الدین خاں تھے جن کو نواب سعادت علی خاں کی بیٹی ولایتی بیگم منسوب تھیں جن سے تاج آرا بیگم پیدا ہوئیں جو حضرت امجد علی شاہ کو بیاہی گئیں اور سسرال سے ملکہ کشور صاحبہ خطاب پایا۔ یہی ملکہ کشور جان عالم واجد علی شاہ کی والدہ تھیں جنہوں نے ملک فرانس کے شہر پیرس میں ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا اور وہیں سپرد خاک کی گئیں۔

ملکۂ آفاق نصیر الدولہ محمد علی خاں پسر نواب سعادت علی خاں کو بزمانہ صاحبزادگی منسوب ہوئیں۔ ان کا نام جہاں آرا بیگم عرف کھیتو بیگم تھا۔ جب بعد انتقال شاہ نصیر الدین حیدر ان کے شوہر نے ۸ر جولائی ۱۸۳۷ء کو محمد علی شاہ کا لقب اختیار

کر کے بعمر تخمیناً ۶۳ سال سریر آرائے سلطنت اودھ ہوئے تو بیگم صاحبہ کو ''نواب ملکۂ آفاق مخدرۂ عظمیٰ ممتاز الزمانی نواب جہاں آرا بیگم عرف کھیتو بیگم'' کا خطاب عطا فرمایا اور پانچ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۹رمئی ۱۸۴۲ء کو انتقال کیا اور امام باڑہ حسین آباد میں مدفون ہوئے۔

کربلائے ملکہ آفاق انہیں کے زمانۂ فرمانروائی میں زیر نگرانی حاجی مرزا محمد علی تعمیر ہوئی۔ جب محمد علی شاہ مالک تاج وتخت ہوئے تو خزانہ خالی، کیونکہ دو عہدوں سے نظم ونسق ملک میں ابتری چلی آتی تھی مگر موصوف نے اپنے پدر نامدار کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے سب سے پہلے معمورئ خزانہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ جب ایک کروڑ روپیہ ملک کی آمدنی سے فراہم ہو گیا تو ملازمین کی تنخواہیں بیباق کیں اور چھ لاکھ روپے بابت دین مہر ملکۂ آفاق کو بھی ادا کئے۔

ملکۂ آفاق سے محمد علی شاہ کے تین اولادیں حسب ذیل ہوئیں۔

(۱) ثریا جاہ مرزا امجد علی خاں، جو بعد وفات محمد علی شاہ تخت نشین سلطنت ہو کر امجد علی شاہ کے لقب سے مشہور ہوئے اور پانچ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۳رفروری ۱۸۴۷ء کو انتقال کر کے امام باڑہ سبطین آباد واقع حضرت گنج میں مدفون ہوئے۔

(۲) نواب سلطان عالیہ بیگم جو بڑی شہزادی مشہور تھیں یہ شاہ زمن غازی الدین حیدر کے نواسہ نواب محسن الدولہ کو منسوب تھیں موصوفہ نے ۱۲۷۰ھ میں اس دار فانی کو خیرباد کہا۔

(۳) نواب روشن آرا بیگم جو چھوٹی شہزادی کے نام سے مشہور تھیں۔ ان کی شادی نواب سرفراز الدولہ کے بیٹے نواب منیر الدولہ کے ساتھ ہوئی۔ سرفراز الدولہ چودھری کی گڈھیا پر رہتے تھے جہاں ان کی جائداد ہنوز موجود ہے مگر اب دوسروں کے قبضہ میں ہے۔

چھوٹی شہزادی محلہ پاٹا نالہ پر متصل امام باڑہ جناب غفران مآب ایک عالیشان محلسرا میں سکونت پذیر تھیں۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء ان کے شوہر کلکتہ ہوتے ہوئے کربلائے معلیٰ کو روانہ ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ اس کے بعد موصوفہ بھی زیارت عتبات کو گئیں مگر واپسی پر بمبئی میں انتقال کیا لاش وہیں سے روانہ عتبات ہوئی۔

ملکۂ آفاق نے بتاریخ ۲۰راکتوبر ۱۸۵۰ء بروز یکشنبہ قریب شام اپنی جائے سکونت حسن باغ میں ہیضہ وبائی سے خاموش زندگی بسر کر کے انتقال کیا اور دوسرے روز انہیں کا تعمیر کردہ امام باڑہ ان کی دائمی آرام گاہ بنا۔ بعد رحلت ان کا لقب مریم مکانی ہوا۔ ان کی قبر پر قطعۂ تاریخ وفات مندرجۂ ذیل لگا ہوا ہے۔

بست چوں رخت سفر بلقیس ثانی زیں جہاں
بود غوغائی قیامت از ثریا تا ثرا
در غمش بودند دریا سینہ زن از دست موج
خاک برسر بد ھوا چوں صر صر ملک سبا
دمبدم بر صفحہ قرطاس ریز د چوں فلک
ھست از تحریر حالش سینہ کلک دوتا
چوں بفکر سال فوتش گشت مائل خاطرم
از سر گردون گرداں داد ھاتف مغفرت
کن دعا صالح چنیں ھر دم برائے مغفرت
حق ببر فردوس منزل ملکۂ آفاق را
۱۲۶۷ھ

مرحومہ کی قبر کے علاوہ اس امام باڑہ میں چار اور قبریں ہیں (۱) سلطان عالیہ بیگم دختر ملکہ آفاق (۲) وحید النساء بیگم صاحبہ (۳) نواب محسن الدولہ شوہر سلطان عالیہ بیگم یعنی داماد ملکۂ آفاق اور مرزا عالی قدر پسر نواب محسن الدولہ نواسہ ملکہ آفاق کی ہیں۔

سید کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ جلد دوم میں

ملکۂ آفاق کی سیرت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

مرحومہ فی الحقیقت صاحب اوقات تھیں، روز وشب عبادت خدا میں بسر کرتی تھیں اور مصائب خامس آل عبؑا میں مصروف رہتی تھیں اور از راہ مآل اندیشی چھ لاکھ روپیہ مہر جو حضرت فردوس منزل محمد علی شاہ نے معرفت نواب امین الدولہ وزیر اعظم بھیجے تھے وہ اور باقی اپنے پاس سے ملا کر مجملہ تیرہ لاکھ کے نوٹ اپنے نواسہ مرزا عالی قدر کے نام لے کر دیے تھے ،جن کا منافع چھ ہزار روپیہ ماہوار ہوتا ہے بطریق قرضۂ مؤید گورنمنٹ سے معرفت نواب منورالدولہ تھے اس صرف سے امام باڑہ میں رونق رہتی تھی اور متروکہ موافق سہم شرعیہ تقسیم ہوا۔

ایک حصہ حاکم وقت یعنی بادشاہ، دوسرا جناب عالیہ نواب ملکۂ کشور بدعویٰ متروکہ پدری نواب حسین الدین خاں مرحوم، تیسرا حصہ بڑی شہزادی زوجہ نواب محسن الدولہ، چوتھا چھوٹی شہزادی زوجہ نواب منیر الدولہ کا ہوا۔ چنانچہ فی کس پانچ لاکھ روپیہ علاوہ جواہر واسباب کے ملا۔ اور تنخواہ دار ملازمین قدیم زن ومرد کے لئے داخل وصیت تھا۔ کئی برس تک یہ انتظام رہا۔ اب وہ سب نوٹ گورنمنٹ سے لے کر نواب محسن الدولہ اپنے خرچ میں لائے۔

اسدالدولہ ضیاء الملک نواب سرفراز علی خاں افراسیاب جنگ عرف مرزا عالی قدر فرزند نواب محسن الدولہ کی شادی نواب علی نقی خاں وزیر اعظم واجد علی شاہ کی دختر عفت آرا بیگم مخاطب بہ عظمت بہو سے ہوئی تھی۔

نواب عالی قدر کا سکونتی مکان عین اس مقام پر تھا جہاں اب چوک کی کوتوالی بنی ہوئی ہے۔ نواب محسن الدولہ کا قدیمی مکان مینا بازار میں تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں منہدم ہو گیا۔ مرزا عالی قدر کا رنگ سانولا مائل بہ تیرگی تھا۔ چہرہ گول بھرا ہوا جس پر چیچک کے ہلکے داغ تھے، مونچھیں بڑی بڑی ہمیشہ سیاہ مخمل کی مندیل دار ٹوپی زیب تن کرتے تھے۔ سہ پہر کو ہوا خوری کے لئے ضرور سوار ہوتے تھے، اس وقت کل سواریاں فینس، ہوادار، پالی گاڑی، گھوڑا ہاتھی اور فٹن وغیرہ تیار رہتی تھیں۔

مگر عموماً فٹن پر سوار ہوتے تھے۔ مشہور ہے کہ ان کے والد کے زمانہ میں بھی یہی دستور تھا۔ نواب عالی قدر نے ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں لاولد انتقال کیا۔ مصرع تاریخ وفات یہ ہے۔

مہر جہاں نشاں عالی قدر ۱۳۱۴ھ

(ماخوذ از ماہنامہ ''الواعظ'' لکھنؤ دسمبر ۱۹۴۴ء)

۞۞۞

(بقیہ صفحہ ۵۶ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

(۱۱۱)

گئیں جو لاش پہ بھائی کی دل سنبھال کے اب
عجیب جرأت و ہمت دکھا گئیں زینبؑ
خدا سے عرض کی لاشے پہ رکھ کے دستِ ادب
ہمارا ہدیۂ آخر قبول کر یا رب
جو روح عدل نے تیری طرف سے چاہی ہے
یہ تیرے حق میں وہ سب سے بڑی گواہی ہے

(۱۱۲)

اگر چہ لٹ گیا اس راہ میں ہمارا گھر
شہید ہو گئے عباسؑ وقاسمؑ مضطر
یہ میرا بھائی، وہ عونؑ ومحمدؑ واصغرؑ
مگر ہے شکر کی جا تیری فتح اے داور
جہاں سے تاج وحکومت کا اعتبار گیا
یہ تیری فتح ہوئی اور یزید ہار گیا

(ماخوذ از ''احساس غم''، مجموعۂ مراثی، صفحہ نمبر ۱۶۱ تا ۲۰۰)

۞۞۞